© rasailojaraid.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

روزوں کا مہینہ ـــــ ماہِ صیام ـــــ جب آتا ہے تو جہاں کہیں دبا دبایا اسلام بھی موجود ہوتا ہے، اس کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جس گھر یا جس بستی یا جس ملک پر اِس ماہِ مبارک کا پَرتو پڑتا ہے، اُس کا نقشہ عام حالات سے بدل جاتا ہے۔ تارکِ نماز لوگ کپڑے پاک کر کے صفِ نماز میں آکھڑے ہوتے ہیں، احکامِ دین کی پابندی سے آزاد رہنے والے مرد و زن روزہ دار ہو جاتے ہیں؛ گھروں اور مسجدوں میں قرآن پڑھا جانے لگتا ہے، کچھ لوگ اسی مہینے میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، بصورتِ دیگر عام صدقات دینے کے لیے ہاتھ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سحری اور تراویح اور افطار کے سلسلے بالکل نئی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بعض غلط مشاغل یا آمدنیوں یا جرائم کے پروگراموں کو اس مہینے میں معطل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ ظاہری علامات ہیں جو اس حدیثِ رسولؐ کی تصدیق کرتے ہیں کہ شیاطین ماہِ رمضان میں پابجولاں کر دیے جاتے ہیں۔

قرآن و سنّت کے سرمایۂ علم و حکمت سے یہ حقیقت اخذ ہوتی ہے کہ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے ساتھ ہی ایک شیطان اُس پر مامور ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کی ملکوتی قوتوں کو بے اثر بنائے اور سفلی رجحانات کو اُبھار کر عصیان و طغیان کی راہ پر اُسے گامزن کر دے۔ اب اگر کوئی صاحبِ ایمان فرد ماہ صیام کا حق ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اپنی جسمانی ضرورتوں اور خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر دیتا ہے، قرآن پڑھتا ہے اور سنتا ہے، نماز باجماعت خصوصاً تراویح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مجمعے میں شریک ہوتا ہے، سحر و افطار کے وقت مسنون کلماتِ ذکر و دُعا ادا کرتا ہے، کچھ خیرات کرتا ہے، بعض لوگوں کا روزہ افطار کراتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا شیطان تو زنجیروں میں جکڑا گیا اور بالکل بے بس ہو کے رہ گیا۔ اس طرح گویا ہزارہا مسلمانوں کے ساتھ لگے ہوئے شیاطین کے سبھی کام کے راستے بند ہو گئے اور وہ مقید ہو کے رہ گئے۔

یہ حدیث جب کبھی بیان ہوتی ہے تو کچھ حضرات یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ اگر شیاطین قید ہو جاتے ہیں تو پھر بُرائی دُنیا میں کیوں باقی رہتی ہے۔ اس کے جواب میں چند نکات قابلِ غور ہیں۔

۱۔ اہلِ کفر و شرک اور ایسے جرائم کار جن کی فطرتِ سلیم تباہ ہو چکی ہو، ایسے ظالم اور مستبد اور متکبر لوگ جنھوں نے اپنے جوہرِ انسانیت کو غارت کر دیا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اسیریٔ شیاطین والی حدیث کا اطلاق اُن پر، اُن کی بستیوں اور اُن کے ممالک پر کیا جائے۔ مثلاً پہلا ماہِ صیام جب روزے فرض کیے گئے تھے، عین اسی مہینے کے وسط میں میدانِ بدر میں وہ پہلا معرکہ حق و باطل گرم ہوا جس کا ایک فریق مسلمان تھے جو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان میں جانیں لڑا رہے تھے، اور دوسرا فریق قریشِ مکہ اور اُن کے حلیف تھے جو پیغمبرِ خدا اور مسلم جماعت کو مٹا دینے کے ارادے سے اُٹھے تھے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمانوں پر کام کرنے والے شیاطین تو مقید تھے، لیکن اشرارِ مکہ کے شیاطین کو قید میں ڈالنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ شیاطین کا کام ایسا ہے کہ جیسے چھوت لگا دینا۔ وہ جب ظلم و شر اور عصیان و طغیان کے جراثیم انسانی قلب میں اُتار دیتے ہیں تو اگر ایمان و ضمیر میں قوتِ مدافعت ہو تو وہ کچھ روک تھام کرتا ہے۔ مگر شیاطین بھی ملیریا کے مچھر کی طرح بار بار اور روز روز جراثیم کی نئی کھیپ اندر داخل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی قلب و ضمیر میں مرض جڑ پکڑ لے۔ اب اگر شیاطین قید میں بھی ہوں تو ان کا کام جاری رہتا ہے۔ اُن کے بوئے ہوئے بیج اگر کسی مٹی میں جگہ پا چکے ہوں تو روئیدگی کا سارا عمل خود بخود ہوتا رہے گا۔ اس دَور میں "آٹو میٹک کنٹرول" کی اصطلاح عام ہے۔ شیاطین بھی اپنے زیرِ اثر انسانوں میں عادت کے قانون کے ذریعے ایک طرح کا آٹو میٹک کنٹرول پیدا کر دیتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیاطین اپنے معمول انسانوں کے قلب و ضمیر میں شیطنت کا ایک اڈا یا عصیان و طغیان کا ایک دفتر قائم کر لیتے ہیں -

۳ - قرآن میں شیاطینِ جن کے ساتھ ساتھ شیاطینِ انس کا حوالہ ملتا ہے - یہ بڑی اہم بات ہے - در اصل انسانوں میں شیطنت کے کام کو پھیلانے کے لیے شیاطینِ انس ہی کی ضرورت ہوتی ہے —— شیاطینِ جن تو ایک یا چند افراد پر خفیہ طریقوں سے کام کرتے ہیں - شیاطینِ انس رو در رو آکر ، اسٹیجوں پر تقاریر کرتے ہیں ، اخبارات میں اداریے اور نوٹ شائع کرتے ہیں اور ادب میں شعر و افسانہ کو فنی جمال کے ساتھ سامنے لاتے ہیں - وہ استدلال کرتے ہیں ، بڑے لوگوں کے حوالے دیتے ہیں ، سلوگن ایجاد کرتے ہیں ، اصطلاحیں وضع کرتے ہیں ، جذباتی اتار چڑھاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں —— ہوٹلوں میں آپ کو چائے پلاتے ہیں - سینماؤں اور نائٹ کلبوں یا کبھی کبھار مسجدوں ، اسکولوں اور لائبریریوں میں آپ کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں - ان شیاطین انس کا کوئی توڑ نہیں - عالمی ادارات میں ، سرمایہ اور پروپیگنڈے کو کنٹرول کرنے والی تنظیموں میں ، فوجوں اور عدالتوں اور پولیس میں ، نہ جانے کتنی تعداد کہاں کہاں گھسی ہوتی ہے - پھر کوئی صدر ہوگا ، کوئی سیکرٹری ، کوئی وزیر ، کوئی ڈائرکٹر ، کوئی محقق ، کوئی کمانڈر ، کوئی ناولسٹ ، کوئی مصور ، کوئی رقاص ، کوئی فلم اسٹار —— غرض ان کے ہزار روپ ہیں -

شیاطینِ جن کا مقابلہ آسان اور شیاطین انس کا مقابلہ بے حد مشکل ہے - مثل ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی - یعنی جس طرح آدمی کو سنوارنے کے لیے خود اسی کی جنس سے انبیاء اٹھائے گئے ، اسی طرح اسے بگاڑنے کا بھی وسیع اور موثر کام آدمی ہی کر سکتا ہے -

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بیرونی قوت کسی ملک پر اپنا پنجہ گاڑنے کے لیے منصوبہ بنائے ، اور پھر اس منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے ہدف بننے والے ملک کے اندر ہی سے وہ کچھ ایسے ایجنٹ فراہم کرے جو فلسفہ و فکر کے دائرے میں ، ادب و شعر کے دائرے میں ، صحافت اور پروپیگنڈے کے دائرے میں اور ٹریڈ یونینز اور لیبر کے دائرے میں ، اساتذہ اور طلبہ کے دائرے میں ، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی گروہوں کے دائرے میں ، بیرونی قوت کی دی ہوئی گائیڈ لائن کے مطابق کام کرتے رہیں - ابلیسی نظام بھی اسی نہج پر کام کرتا ہے ، افراد کی انفرادی زندگیوں میں خلل اندازی کے علاوہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیاطین تاک کر ذہین لوگوں اور اہم شخصیتوں اور بااثر اکابر اور نوجوان ایجی ٹیٹرز پہ اپنا جادو چلاتی ہیں یا شیطنت کے جراثیم ان کے اندر اتارتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود شیاطین کے کان کترنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اب شیاطینِ جن کا کام ختم ہو گیا۔ انہوں نے شیاطینِ انس تیار کر کے میدان میں اتار دیے۔ اب خود انہیں تو صرف جائزہ لیتے رہنا ہے اور رپورٹیں اور اعداد و شمار مرتب کرنے کا اہتمام رکھنا ہے۔

اس بار ماہ صیام آیا تو معاشرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں شیطانوں کو زیادہ بھاری زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں کم سے کم لاہور کی حد تک (جہاں تک میرا مشاہدہ محدود ہے) بالعموم ایسا نہیں ہے کہ لوگ چلتے پھرتے سگریٹ پی رہے ہوں، یا پانی کی دکانوں پر کوکا کولا اور سیون اَپ سے شاد کام ہونے والوں کی قطاریں لگی ہوں یا چھوٹے بڑے ہوٹلوں، تنوری طعام خانوں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی بیچنے والے "فٹ پاتھیوں" نے چادریں تان رکھی ہوں اور ایسے مریضانِ عشق ہر جگہ ہجوم کیے ہوئے ہوں جو زبان حال سے ایک بہت پرانی مشہور گھسی پٹی غزل کا یہ مصرعہ الاپ رہے ہوں کہ "میں مریضِ عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہے"۔ اب کے وہ پردے والے مریضانِ عشق بھی غائب ہیں، اور بنابریں پردے بھی غائب! طعام اور شربت وغیرہ کی دکانیں کہیں تین چار بجے شام کو کھلتی ہیں۔ دوپہر یا قبل دوپہر کو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نے پانی کی دکان سے فانٹا یا آرسی کی بوتل مانگی اور دکاندار نے انکار کر دیا۔

یہ تبدیلی اس حد تک صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مسجدوں میں خطبوں اور کتابی اور اخباری تحریروں کے ذریعے تو پہلے ہی احترامِ رمضان کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور بہت سے لوگ اسی تلقین کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر احتیاط کرتے ہیں۔ مگر جب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ابتدائے رمضان کے وقت احترامِ رمضان کی اپیل کی ہے اور اس کے لیے حکومت اور اس کے کارندے نیک نیتی اور مستعدی سے حرکت میں آگئے ہیں تو پھر کیسے رمضان کے ساتھ وہ مذاق روا رکھا جا سکتا ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے ہاں کے بڑے اور چھوٹے دُنیا پرستوں اور شکم پرستوں نے روا رکھا ہے۔

دوسرا اچھا شگون یہ ہے کہ متذکرہ صورتِ حالات گواہی دیتی ہے کہ پاکستانی قوم جیسے بھی بُرے احوال سے دوچار چلی آ رہی ہے، اگر اس کی اصلاح صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہر قسم کی پستیوں سے نکالا جا سکتا ہے۔

ہم اسی تصور کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ایک طرف دعوت و تلقین اور تربیت و تزکیہ کا کام ہونا چاہیے، دوسری طرف حکومت کو اجتماعی پہلو سے جو حصہ کسی امر کے نفاذ یا انسداد کے لیے ادا کرنا لازم آتا ہے، وہ اُسے کرنا چاہیے، اور پھر یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ قوم خیر و فلاح کی طرف ہی لپکے گی۔

احترامِ رمضان کا یہ تصور بڑا کمتر درجے اور منفی نوعیت کا ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔

اصل احترامِ رمضان یہ ہے کہ رمضان آئے تو آدمی عبادت و طاعت کے لیے کمر کس لے۔

احترامِ رمضان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں، تراویح ادا کی جائے، قرآن کو پڑھا، سُنا اور سمجھا جائے اور اس کو سرمایۂ عمل بنایا جائے۔

احترامِ رمضان یہ ہے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹے فلسفوں اور جھوٹے تصورات پر عمل کرنا ترک کیا جائے، غیبت، چغلی، بدزبانی اور بہتان بازی سے اجتناب کیا جائے۔

اور احترامِ رمضان ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا نہ تو ذخیرہ کیا جائے، نہ انہیں زائد منافع کے لیے فروخت سے روکا جائے، نہ ناپ تول میں فرق کیا جائے اور نہ گراں فروشی کی راہ اختیار کی جائے۔ اس ایک مہینے میں خدا اور رسولؐ کی محبت اتنی تو کارفرما ہونی چاہیے کہ بڑے بیوپاری اور چھوٹے کاروباری بہت ہی کم منافع پر اکتفا کریں، یا بعض صورتوں میں کوئی چیز بغیر منافع کے فروخت کریں، اور زیادہ بلند مقام یہ ہے کہ نقصان اُٹھا کر بھی خدا کے بندوں کو سہولت دی جائے۔ یقیناً اس ایثار کے بدلے میں اللہ تعالیٰ بقیہ گیارہ مہینوں میں ایثار کرنے والوں کو خاص برکات سے نواز سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے یہاں پہلے ایک روشن مثال ایسی قائم ہو چکی ہے کہ اسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ آج بھی ایسا ممکن ہے۔ جہاد ستمبر ۱۹۶۵ء کے دنوں میں اشیاء کی رسد میں مشکلات غیر معمولی تھیں، مگر لاہور کی حد تک تو میں گواہی دیتا ہوں کہ یہاں ضروریات کے نرخوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب اگست ۱۹۷۸ء میں وہی کچھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ شہروں کے ہر محلے اور باہر کے ہر گاؤں میں ایسے لوگ ہونے چاہییں تھے جو افطار یا غذا کے مختلف سامان خرید کر باری باری روزہ داروں کو مختلف دنوں میں مفت فراہم کرتے۔ مثلاً کوئی صاحب اپنے گھر کے آس پاس کے دس، بیس یا سو پچاس گھروں میں کسی دن مفت گوشت تقسیم کرا دیتے، کسی دن کوئی صاحب پاؤ پاؤ بھر انگور یا کھجور کے دو چار درجن پیکٹ بانٹ دیتے۔ ایک ایک حلقے میں اگر ایسے دس دس اہلِ خیر آگے آجاتے تو معاشرے کی فضا بے حد متاثر ہوتی۔ شاید دکانداروں کو بھی گراں فروشی پر شرم آنے لگتی۔ مختلف رُخوں کی طرف سے ایسا سلسلۂ خیر جاری ہو سکتا تھا۔

ان ساری چیزوں کے بعد احترامِ رمضان کی وہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری یا مسافرت یا کسی اور وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا ہو تو کم سے کم اس کی روزہ خوری کا حال دوسروں پر کھلنا نہیں چاہیے کہ یہ روزہ خوری کی تبلیغ کی ایک صورت ہے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرا جرأت حاصل کرتا ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ اس مرتبہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے خود ہی افتتاحِ رمضان کی تقریب میں یہ ضرورت ظاہر کر دی کہ یوم پاکستان یا یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منایا جانا چاہیے۔

فی الحقیقت دورِ نبوت کے سانحہ رمضان کے سلسلے میں پاکستان کو ایک مبارک نسبت حاصل ہے۔ وہاں مدینہ کی اسلامی ریاست کا ظہورِ عام غزوۂ بدر سے ہوا۔ اور غزوۂ بدر اس پہلے ماہِ صیام کے وسط میں واقع ہوا جس میں روزے فرض کیے گئے تھے۔ پھر یہی رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کا اسی مہینے میں واقع ہونا اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ تو ہماری بدقسمتی تھی کہ انگریزی دور کے مسلط کردہ عیسوی کیلنڈر نے ہمارے ہجری کیلنڈر کو دبائے رکھا۔ اب اگر پاکستان میں ہجری کیلنڈر کو اہمیت دی جائے اور " ایام اللہ " پر ہماری نظریں مرتکز ہوں تو ہمارے بہترین جذبات کی آبیاری ہوسکتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی سال یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منانے کا اعلان ہو جاتا اور اس کی تعمیل ہو جاتی۔

اب یہ سعادت آگے کے لیے ملتوی ہوگئی ہے۔

باتیں رمضان المبارک کی چھڑ گئیں، حالانکہ جب یہ اوراق قارئین تک پہنچیں گے تو یا تو وہ عید منا رہے ہوں گے، یا اس کے لیے تیاریاں کر رہے ہوں گے۔

ہماری عید کا مرکزی جوہر نماز عید اور صدقہ فطر اور تکبیرات ہیں۔ یہ ہماری مخصوص اسلامی تہذیب ہے کہ ہم یوم مسرت بھی مناتے ہیں تو خدا فراموشی کی کیفیت نہیں ہوتی۔ ہم ایک لمبے دورِ عبادت کی آزمائش و تربیت کے دور سے کامیابی کے ساتھ گذرنے پر خدا کے شکر کے طور پر عید الفطر مناتے ہیں۔ ہر چند کہ اچھے کپڑے پہننے اور اچھے کھانے کھانے اور عزیزوں دوستوں سے میل ملاقات اور بچوں کی تفریح اور جائز قسم کے کھیل تماشوں کی گنجائش دی گئی ہے۔ مگر عید الفطر کو کسی ایسے طریق سے نہیں منانا چاہیے کہ روزے رکھ کر اور تراویح پڑھ کر اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے اور صدقہ و خیرات کر کے جو کردار پیدا کیا گیا ہو، اسے طوفانِ مسرت میں ڈبو دیا جائے، اور پھر سارا سال اس طرح گذرے کہ نہ خدا کا خوف، نہ رسولؐ کی محبت اور نہ آخرت کے حساب کتاب کا تصور۔ بس جہازِ عمرِ رواں پر سوار سنجانے کدھر سے کدھر جا رہے ہیں۔

عید اس طرح منانی چاہیے کہ ماہِ صیام کی برکات ہمارے ساتھ رہیں اور سارا سال ہمارے لیے زادِ راہ بنی رہیں۔

(باقی اشارات بر صفحہ ۴۶)

© rasailojaraid.com